تیاگ

چراغ ہبلوی

دھارواڑ، کرناٹک، موبائل: 9972948706، ای۔میل: charaghhublavi@gmail.com

وہ نعرے پہ نعرہ لگائے جا رہا تھا۔ چیخ چیخ کر اس کا گلا پھٹ سا گیا تھا۔ منہ سے جھاگ نکلتا تو آستین سے پونچھ لیتا تھا۔ کوئی راہگیر ایسا نہیں تھا جو کچھ دیر کے لیے رک کر اس کی بات سنتا۔ جب وہ نعرے لگا لگا کر تھک گیا تو اس نے اپنی پیٹھ کو دیوار سے چپکا لیا، اور سر سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ پھر وہ سوچنے لگا...لوگ کتنے بے حس ہو گئے ہیں۔ شہر کے بڑے بڑے لوگ، پروفیسر، ڈاکٹر، لکچرار، اردو کے ماہر اساتذہ اور اردو کا دم بھرنے والے شاعر و ادیب کو اس نے اپنی بھوک ہڑتال میں شریک ہو کر اردو کو اس کا حق دلانے کی التجا کی تھی۔ کچھ نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا تھا اور کچھ نے سٹھیا گیا ہے سمجھ کر اس سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ کتنا مشکل ہے اپنوں کو اپنا بنانا۔ کیا کچھ نہیں کیا اس نے اردو کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے میں۔ ایک ایسے گاؤں میں اس نے اردو اسکول کھولا تھا۔ جہاں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ فی صد تھی، مگر اردو بولنے والا کوئی نہیں تھا۔ جب کہ اسے معلوم تھا کہ شہر کے اردو اسکول لا پروائی اور اردو دشمنی کے نتیجہ میں بند ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ تو یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جاتا تھا کہ جب اردو نہیں رہے گی تو ہماری تہذیب و ثقافت کا کیا ہوگا۔ ہماری نئی نسل ہمارے کلچر اور ہماری تاریخ کو کیسے جانے پہچانے گی۔ اسی لیے اس نے ایک بیڑا اٹھایا تھا کہ وہ اردو کو گاؤں گاؤں پھیلائے گا۔ رحمت ہر بار اسے منع کرتا کہ اس بے حس گاؤں میں کوشش بیکار ہے۔ رحمت اس کا کنڑا میڈیم دوست تھا۔ آخری بار جب وہ شہر جانے لگا تو رحمت اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''تو تم نے اپنے آپ کو تیاگ دینے کا پکا ارادہ کر ہی لیا ہے۔''

''ہاں..کیوں نہیں...دیکھنا اب کی بار ضرور کامیاب لوٹوں گا۔'' ہم لوگ اردو کے لیے زبانی جمع خرچ تو بہت کرتے ہیں، لیکن عملی کام بہت کم کرتے ہیں۔ ہم صرف نعرہ لگانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ''اردو زندہ باد۔'' ''اردو کو اس کا حق دو۔'' اردو کو اس کا حق مل سکتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اردو کی بقا و ترقی کے لیے ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے اور اردو کی محبت کو دل میں بسانا چاہیے۔''

''تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔ میں تمہارے خیالات سے متفق ہوں.....مگر کیا تمہارے اردو میڈیم اسکول دوسرے اسکولوں کا مقابلہ کر پا رہے ہیں؟ جب کہ اردو ٹیچر ہی اپنے بچوں کو''.....رحمت کہتے کہتے رک گیا۔ بس دور سے دھول اڑاتی آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بس کو رکھوایا، اور سوار ہو کر کھڑکی والی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وہ پانچ سال سے وہاں نوکری کر رہا تھا۔ پہلے تو اس نے کرایہ پر مکان لے کر بچوں کو اردو پڑھانا شروع کیا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنی محنت و لگن سے دو کمروں پر مشتمل اسکول تعمیر کروایا۔ گھر گھر جا کر بچوں کو اردو اسکول بھیجنے کی منت وسماجت کرتا تھا۔

''ارے ہاں عبدالحق بھائی...! خوب یاد آیا...اپنا اطہر چھ سال کا ہو گیا ہے...اسے اسکول میں داخل کرانا ہے نا؟ بس آپ کی مدد چاہئے۔'' اس نے التجا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

جی ہاں کیوں نہیں۔ یہ تو آپ کا بڑپن ہے جو آپ میری مدد کر رہے ہیں۔ بتائیے کہاں...کون سے اسکول میں داخلہ کرائیں؟''

''آپ کے اپنے اردو اسکول میں!'' اس کی آواز میں معصومیت و لجاجت تھی۔

''نہیں جناب....اردو اسکول نہیں....میں سمجھ رہا تھا آپ کسی اچھے کانونٹ اسکول کے بارے میں بتائیں گے۔''

''عبدالحق بھائی...ہم اور آپ اپنے بچوں کو اردو اسکول نہ بھیجیں گے .....تو اردو اسکول کا کیا ہوگا؟ اور ہماری تہذیبی زبان اردو کا کیا ہوگا؟''

''جناب.... برامت ماننا..! اردو کا مستقبل کیا ہے یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہی ہیں۔ دوسری زبانیں پڑھ کر بچہ ترقی کر سکتا ہے، مگر اردو میں''.....

وہ لوگوں کو یہی سمجھانا چاہتا تھا کہ اردو میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بڑی

سی بڑی ڈگریاں لی جاسکتی ہیں۔ پہلے ہم خود اس کی اہمیت کو سمجھیں تو۔!!

بس اپنی رفتار سے دوڑ رہی تھی کہ ایک جھٹکے نے اسے خیالوں سے باہر کر دیا۔ وہ کھڑکی سے جھانک کر اپنے اسٹاپ کو دیکھنے لگا۔ بس ایک سرکل پر آ کر رک گئی۔ وہ اتر گیا اور پیدل چل کر بائیں طرف مڑ گیا۔ جہاں مائناریٹی کمشنر آفس تھا۔ اس آفس کا وہ بارہا چکر لگا چکا تھا۔ ہر بار محکمہ کے لوگ ''آپ کو، اور اردو کو اس کا حق ضرور دیا جائے گا'' کہہ کر ٹرخا دیتے تھے۔ پچھلے ایک سال سے اس کا اسکول بچے نہ ہونے کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح پھر سے اسکول کھلے۔ وہ پہلے سے زیادہ محنت کرے گا۔ اس نے باہر کے بھی بہت سے بچے جمع کر لیے تھے۔ اسے اسکول کا بند ہونا ہرگز گوارہ نہیں تھا۔ کتنی محنت سے اس نے ایک اردو کا پودا لگایا تھا۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی بستی میں اردو جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ پچھلی بار اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اسکول دوبارہ نہ کھولا گئی، تو آفس کے سامنے بھوک ہڑتال پر بیٹھے گا۔! اور تب تک نہیں اٹھے گا جب تک اسے آرڈر کاپی نہیں مل جاتی۔ بھلے اس کی جان چلی جائے۔

دن کافی چڑھ چکا تھا، مگر کہیں دھوپ کا اتہ پتہ نہیں تھا۔ کل رات سردی بہت تھی۔ شاید اسی لیے ابھی بھی اوس کے اثرات باقی تھے۔ وہ بدستور دیوار سے اپنی پیٹھ چپکائے، سر سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ چپراسی اسے بار بار مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے کئی بار چائے پانی کے لیے پوچھا بھی تھا اور رات میں اوڑھنے کے لیے چادر بھی بڑھا دی تھی، مگر اس نے منع کر دیا تھا۔ چپراسی سے رہا نہیں گیا۔ نزدیک آ کر اس نے ''بھائی صاحب بھائی صاحب'' کہہ کر آواز دی۔ جب کوئی حرکت نہیں ہوئی تو اس نے کندھا ہلایا۔ ''بھائی صاحب'' دفعتاً وہ زمین پر گر گیا۔

دھیرے دھیرے لوگ جمع ہونے لگے۔ کسی نے پاس پڑے بینر کو اٹھا کر دیکھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سب لوگ نفی میں سر ہلا رہے تھے۔ اتنے میں لوگوں کو چیرتا ہوا ایک آدمی آیا۔ چپراسی نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ کے اشارہ سے سلام کیا۔ وہ شخص کچھ پریشان سا ہوا، پھر خاموش بلڈنگ کے اندر گھس گیا۔ کسی نے چپراسی سے پوچھا۔ ''وہ کون تھا''.....؟

''ارے صاحب.....وہ میر صادق صاحب ہیں۔ اردو ڈپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ۔''

ایمبولنس ہارن بجاتی ہوئی آ کر رک گئی۔ اسے چار آدمیوں کی مدد سے امبولینس کی طرف لے جایا جانے لگا۔ ایک شخص بینر پکڑے ہوئے تھا۔ اوپر آفس کے شیشوں سے میر صادق جھانک رہا تھا۔ اس کی نظر بینر پر پڑی تو اس نے فوراً اپنا سر جھکا لیا۔ وہ بینر سے نظریں ملا نہیں پا رہا تھا۔ جس پر جلی حرفوں سے لکھا تھا۔ ''ہم جئیں گے اور مریں گے اے اردو تیرے لیے۔''

○○

انتخاب کلام شمیم کرہانی

شمیم کرہانی ایک معروف ومقبول شاعر تھے۔ خوش روئی وخوش خوئی، خوش گوئی وخوش گلوئی ان کی اس مقبولیت کے اہم عناصر تھے۔

وہ ایک قادرالکلام اور پُرگو شاعر تھے۔ تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں غمِ جاناں بھی ہے، غمِ دوراں بھی۔ غمِ دل بھی ہے غمِ روزگار بھی۔ غمِ حیات بھی ہے غمِ کائنات بھی۔ ان کی غزلوں میں داخلیت وخارجیت، روایت اور عصری حسیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود جامعیت کا حامل یہ انتخاب ان کی شاعرانہ شخصیت کا پورا احاطہ کرتا ہے۔

مرتب: پروفیسر حنیف کیفی، صفحات: ۹۶، قیمت: ۲۵ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی